© rasailojaraid.com

اسلامی تصوف کا نشو و نما

از

جناب گوپی چند نارنگ ایم۔ اے
(ریسرچ سکالر، دہلی یونیورسٹی۔ دہلی)

ذہنی پس منظر پیغمبرِ اسلامؐ کی وفات کے کچھ ہی بعد اسلام میں معاشی، سیاسی اور سیاسی وجوہ کی بنا پر کئی فرقے پیدا ہوگئے۔ ان میں سب سے اہم شیعہ اور معتزلہ تھے۔ معتزلہ اسلام کے عقلی رجحان کے سب سے پہلے علم بردار تھے تعریف ذات کا جو تصور انھوں نے پیش کیا وہ صرف عقل کی بنا پر تھا۔ اس کا ردِ عمل یوں ہوا کہ توکل اور عبادت کے رجحانات جو اسلام میں پہلے سے موجود تھے، زور پکڑنے لگے، ان کی نمائندگی فقہائے سلف اور علمائے دین نے کی۔ ایک مدت تک ان دونوں گروہوں کے مابین سخت مخالفت جاری رہی۔ معتزلہ اور حکما کے گروہ نے آگے چل کر فلسفہ، دہریت اور زندیقیت کی شکلیں اختیار کیں اور علماً میں خارجیہ اور صفاتیہ کی تحریکیں وجود میں آئیں۔ لیکن مذہب کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے سے یہ ہر دو گروہ قاصر تھے۔ معتزلہ مذہب کو عقل کی کسوٹی پر کستے تھے جس سے عوام کے عقائد میں تذبذب پیدا ہوگیا اور مذہبی اعتقاد اور یقین غائب ہونے لگا۔ شخصی اور قومی زندگی میں اسلام نے جو مرکزیت پیدا کی تھی وہ بھی شک و شبہ کی نذر ہونے لگی۔ دوسری طرف علما اور فقہائے منقولات پر اس قدر زور دیا کہ مذہب چند بے روح اصولوں کا سخت گیر ضابطہ بن کے رہ گیا۔ اور قرآن کے سیدھے سادے اصول دور از کار علم الکلام میں گم ہوگئے ذہنی ہیجان کی اس فضا میں عوام ایک طرف معتزلہ کی عقلیت سے اور دوسری طرف علما اور فقہا کی ظاہر پرستی سے یکساں بے زار تھے۔ اندریں حالات ضرورت تھی کہ مذہب کو بے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بے محل ظاہر پرستی سے آزاد کرا کے اس کی اصل روح کو بے نقاب کیا جائے اور مذہبی معاملوں میں عقل کی نارسائی ثابت کر کے گہرے مذہبی احساس کے لئے گنجائش نکالی جائے۔ زندگی کے ان تقاضوں کا ساتھ دینے کے لئے تصوف کو برسرِ کار آنے کا موقع مل گیا۔

حسن عشری (المتوفی اھ - ۹۳۱ء) وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اپنے نظریات کے ذریعہ معتزلہ اور علماء دونوں میں سمجھوتہ کرانے کی کوشش کی ان کا تعلق پہلے معتزلہ سے اور پھر علمائے دین سے رہا۔ انھوں نے معتزلہ کے منطقی استدلال کو اپنایا، لیکن خدا کا جو تصور پیش کیا اس میں صفاتیہ اور مشابہتیہ کی بہت سی صفات کو برقرار رکھا[1]۔ عشری کے ایک صدی بعد باقلانی Baqillani نے انکی نظریات کی ترویج کی[2] اور پھر گیارہویں صدی میں انھی کے جانشین امام غزالی (متوفی ۱۱۱۱ء) نے ان کی فلسفیانہ تکمیل کی۔ غزالی کے نظریات اسلامی دینیات کا وہ نقطۂ ارتقا ہیں جنہیں تاریخ صدیوں سے طے کر رہی تھی معتزلہ اور ان کے بعد آنے والے فلسفیوں، دہریوں اور زندیقوں نے عقلِ محض کو ہی آخری حجت قرار دے رکھا تھا۔ غزالی نے اپنی غیر معمولی قوتِ استدلال سے اس کی نفی کی اور یہ ثابت کر دیا کہ کشفِ حق عقل کے ذریعہ ممکن نہیں بلکہ اس کے لئے وارداتِ قلب لازمی ہے[3]۔ اس طرح امام غزالی نے تصوف کے ان رجحانات کو جو مذہبی احساس کی بعض بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے آغازِ اسلام سے آہستہ آہستہ سامنے آ رہے تھے، ایک مستقل بالذات مسلک کی حیثیت دے دی۔

سماجی محرکات | آغازِ اسلام کی پہلی صدی ہی میں اسلامی سلطنت کی وسعت کئی گنا بڑھ گئی۔ فتوحات کے علاوہ میں کامرانی اور خوش حالی کا بھی دور آیا جس کا اثر روزمرہ کی زندگی پر نہایت گہرا ہوا۔ ادب

---

[1] سید امیر علی: SPIRIT OF ISLAM - ص ۲۱۳۔

[2] ڈاکٹر تارا چند: INFLUENCE OF ISLAM ON INDIAN CULTURE ص ۵۸

[3] تاریخ تصوف اسلام: پروفیسر علی نوادیونی ورسٹی (اردو ترجمہ۔ رئیس احمد جعفری) ص ۲۶۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خلیفۂ وقت کا تعلق خانقاہ و مسجد سے نہیں بلکہ تخت و تاج سے رہنے لگا۔ بادشاہ اب ممبر و مینار سے الگ قصر و ایوان میں نہایت جاہ و حشم سے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اسلام میں یہ تبدیلی معاویہ (۶۰ - ۶۶۱ء) کے عہدِ حکومت سے آنا شروع ہوئی۔ معاویہ کا بیٹا اور ولی عہد یزید (۶۸۳ - ۶۸۰ء) بلا کا شراب نوش تھا۔ دار السلطنت کے مکہ سے دمشق آجانے سے بھی مذہبی احساس کی پہلی سی شدت باقی نہ رہی۔ عرب کی سادہ مزاج اور سخت گیر ہیبتیں شام کی نرم آہنگ، رنگین فضا میں کچھ سے کچھ ہو گئیں۔ جب دار الحکومت بغداد تبدیل ہوا تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ عیش کوشی اور خوش معاشی (ویسے ہی) عام تھی، اب عربی کی جگہ فارسی نے لی تو مذہب سے لاپرواہی کے رجحانات اور بھی گہرے ہو گئے۔ اس وقت نہ صرف بادشاہ بلکہ سلطنت کے تمام اُمرا اور وزرا، مذہبی احساس سے بے بہرہ اور لذتِ نفس میں مست و خراب تھے۔

دین دار طبقہ کے بہت سے بزرگوں نے حکومت وقت سے قطع تعلق کر لیا اور گوشہ گیر ہو گئے کیوں کہ حکومت کی ملازمت اب دینی تقاضوں سے ٹکرانے لگی تھی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا بیان ہے کہ بنو امیہ نے اپنے طرزِ عمل سے ایسا شدید تقابل پیدا کر دیا کہ ملت کے جذبات کو سخت صدمہ پہنچنے لگا۔ لوگ حسرت و یاس کے ساتھ رسول اللہ اور خلفائے راشدین کے زمانے کو یاد کرنے لگے۔ زیاد، مغیرہ بن شعبہ، اور حجاج کے مظالم سے لوگ کانپ اُٹھتے تھے۔ حجاج بن یوسف کے مظالم کو دیکھ کر حضرت خواجہ حسن بصری (متوفی ۷۲۸ء) کو اتنی تکلیف ہوئی کہ گیارہ سال تک گوشہ گیر رہے اور جب حجاج کے مرنے کی خبر سنی تو اللہ کا شکر بجا لائے۔ واقعہ کربلا، محاصرہ مکہ، واقعہ حرہ یہ سب ایسے واقعات تھے جن سے مسلمانوں کے دین دار طبقے کو شدید رنج ہوا۔[1]

ان حالتوں میں راسخ العقیدہ اور صاحبِ ایمان لوگوں کے لئے اس کے سوا چارہ

---

[1] تاریخ مشائخ چشت، ص ۶۸، ۶۹، ۷۰۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ تھا کہ وہ ایسے معاشرے سے علیحدگی اختیار کر لیں جو تباہی اور بربادی کی طرف بڑھ رہا تھا، پس ماندہ اور متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے کی بنا پر اعلیٰ طبقہ کے خلاف آواز اٹھانا ان لوگوں کے لئے خطرہ سے خالی نہ تھا اس لئے عموماً گوشہ گیری کو ترجیح دی گئی۔ لذت پرستی اور عیش کوشی کا ردِ عمل ان لوگوں میں کثرتِ ریاضت اور زہد و ورع کے رجحانات کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یہ وہ سماجی فضا تھی جو صوفیانہ تصورات کی تشکیل میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔

پروفیسر براؤن نے امام قشیری (متوفی ۱۰۷۳ء) کی سند سے بتایا ہے کہ یہ دین دار بزرگ رسول اللہ اور صحابہ کرام کے نقشِ قدم پر چلنا سعادت سمجھتے تھے اور اس رعایت سے انھیں تابعین اور تبع تابعین کہا جاتا تھا[1] مسعودی کے بیان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ ایسے لوگ جو ریاضت و عبادت میں خاص اہتمام کرتے تھے، نہایت سادہ لباس پہنتے تھے جو صرف ایک خرقہ پر مبنی تھا۔ یہ خرقہ عموماً صوف (اونی کپڑا) کا بنا ہوتا تھا[2]۔ پروفیسر نکلسن ابن خلدون کا حوالہ پیش کرتے ہوئے اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اربابِ جاہ و حشم کے فاخرہ لباس کے مقابلے میں صوف کا یہ خرقہ یا جبہ زہد و اتقا کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ اپنے اسی لباس کی رعایت سے آگے چل کر یہ بزرگ صوفی کہلانے لگے[3]۔ اسلام میں صوفی کی اصطلاح اپنے موجودہ معنوں میں شروع نویں صدی میں مروج ہوئی۔

تصوف کا پہلا دور زہاد اور عُبّاد

تصوف کی نشو و نما کے دو دور قرار دیئے جاتے ہیں[4] پہلا دور اسلام کی ابتدا سے نویں صدی کے آغاز تک اور دوسرا نویں صدی سے بارہویں صدی تک۔ پہلے دور میں تصوف کوئی جداگانہ مسلک نہ تھا بلکہ راسخ العقیدہ مسلمانوں میں سے

---

۱ LITERARY HISTORY OF PERSIA؛ ص ۲۹۷ ۲ ایضاً ص ۴۱۷

۳ LITERARY HISTORY OF ARABS؛ ص ۲۲۸

نیز لفظ 'صوفی' کی اصل کے لئے ملاحظہ ہو: تاریخ تصوف اسلام ص ؛ ۸۲ - ۱۷۹، براؤن ص ۲۱۷، سید امیر علی ؛ ص ۵۹ ۴ اور خلیق احمد نظامی ؛ ص ۱۶ ؛

۴ نکلسن ؛ L.H.A. ؛ ص ۳۸۳ ڈاکٹر تارا چند : I.I.I.C. ؛ ص ۶۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ لوگ جو ریاضت اور عبادت، قناعت، توکل، زہد، ورع اور روحانی ذوق وشوق میں دوسروں سے زیادہ اہتمام کرتے تھے، صوفی کہلاتے تھے۔[۱] دوسرے دور میں تصوف نے نہ صرف اپنے مابعد الطبیعیاتی نظریات مرتب کر لئے بلکہ یہ کئی مختلف سلسلوں اور گروہوں میں بھی بٹ گیا۔

اسلام میں تصوف کا آغاز حیاتِ طیبہ سے ہوا۔ احادیثِ قدسی اور غیر قدسی سے حضرت محمدؐ کی روحانی زندگی کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ صرف خدا کی طرف متوجہ رہتے تھے اور حُبِ دنیا سے آزاد تھے۔ ان کے بعد حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی زندگی بھی روحانی پرتو سے جلوہ نگن تھی۔ صحابہ کرام نے بھی زندگی کا جو نمونہ پیش کیا تھا وہ زہد و تقویٰ کا آئینہ دار تھا۔ پہلے دور کے زاہدوں اور عابدوں نے زہد و تقویٰ کے انھیں رجحانات کی پیروی کی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلامی تعلیمات رہبانیت کے خلاف ہیں لیکن قرآن نے اللہ کا جو تصور پیش کیا، زُہد و فقر کے رجحانات اس کا لازمی نتیجہ تھے نکلسن کا بیان ہے کہ قرآن میں اللہ کی عظمت اور جلالت نے اس کے رحم و محبت کے اوصاف کو دبا دیا ہے۔ قرآن میں یوم الدین اور اس کی دہشتوں کا ذکر بھی بڑے موثر انداز سے کیا گیا ہے۔ حد سے بڑھے ہوئے احساسِ گناہ اور خوفِ سزا و جزا نے اسلامی زہد و فقر کے رجحان کی نشو و نما میں مدد دی[۲]

اس کی ایک مثال خواجہ حسن بصری (متوفی ۷۲۸ء) کی شخصیت ہے۔ ان پر ہر وقت خشیتِ الٰہی کا غلبہ رہتا تھا۔ اس کی تصدیق ان کے ان مکتوبات سے ہوتی ہے جو انھوں نے عمر بن عبد العزیز (متوفی ۷۲۰ء) کو لکھے[۳]۔ ان کا اعتقاد تھا کہ حزن دوا تصفیۂ قلب کا بہترین وسیلہ ہے، اس رعایت سے ان کے مسلک کو زُہد مع الخوف

---

[۱] ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب ص ۳۹۸ [۲] ایضاً L. H. A. P 226 [۳]
[۴] پروفیسر آربری: SUFISM ص ۳۳ [۵] تاریخ تصوفِ اسلام ص ۱۴۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا نام دیا جاتا ہے[1]۔

آغازِ اسلام کی پہلی دو صدیوں کے زاہد اور عابد ہی تصوف کے پیش رو تھے۔ لفظ صوفی کا اطلاق بقول جامی سب سے پہلے کوفہ کے ابو ہاشم (متوفی ۷۷۶ء) پر کیا گیا[2] لیکن پرفیسر نکلسن اور گولڈ زیہر اس دور کے زاہدوں کو صوفی کہنے میں محتاط نظر آتے ہیں اس زمانہ میں ہر چیز صرف دین سے وابستہ تھی۔ شخصی طور پر جو زہد و عبادت کی طرف زیادہ مائل ہوتا تھا، وہ زاہدوں اور عابدوں میں شمار ہونے لگتا تھا، دین کے معاملہ میں زیادہ توجہ دینے والے نساک اور بکائین کے ناموں سے بھی پکارے جاتے تھے۔

کوفہ اور بصرہ سے زہد و ورع کے یہ رجحانات سارے عالم اسلام میں پھیل گئے۔ لیکن انھیں سب سے زیادہ مقبولیت خراسان میں نصیب ہوئی بلادِ اسلام کا یہ صوبہ کسی زمانہ میں بدھ مذہب کا گہوارہ رہ چکا تھا۔ بلخ کے شہزادے ابراہیم بن ادہم (متوفی ۷۷۷ء) کا تعلق اسی سرزمین سے بتایا جاتا ہے۔ تاج و تخت ٹھکرا کر فقیر ہو جانے کی جو حکایات ابراہیم بن ادہم سے منسوب ہیں، ان میں اور مہاتما بدھ کے حالاتِ زندگی میں گہرا انطابق پایا جاتا ہے۔ اس کی تصدیق تقریباً تمام مستشرقین نے کی ہے[3]۔ شقیق بلخی (متوفی ۸۱۰ء) ابراہیم بن ادہم کے مرید تھے۔ توکل کو سب سے پہلے 'حال' قرار دینے کا فخر انھیں حاصل ہے۔ خراسان سے تعلق رکھنے والے دوسرے زاہدوں کے نام یہ ہیں: حاتم الاصم (متوفی ۸۵۲ء) مرو کے عبداللہ بن مبارک (متوفی ۷۹۷ء) اور بشیر بن الحارث الحافی (متوفی ۸۴۱ء)۔

اسی دوران زہد و ورع کے ان رجحانات کی نشو و نما عراق میں بھی جاری رہی۔ خراسان نژاد فضیل بن عیاض (متوفی ۸۰۳ء) نے اپنی عمر کا آخری حصہ کوفہ اور مکہ میں

---

[1] تاریخ تصوف اسلام، ص ۱۴۴ [2] براؤن: L.H.P ص ۲۹۹

[3] نکلسن: L.H.A، ص ۳۸۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گزارا۔ انھوں نے بھی خوفِ خدا اور حُبِّ دنیا سے نفرت پر زور دیا ہے۔ لیکن تصوف میں محبت کا عنصر شامل کرنے کا شرف رابعہ عدویہ (متوفی ۸۰۱ء) کو حاصل ہے۔ تصوف میں محبت کی آمیزش سے اس کی جذبات انگیزی اور وجد آفرینی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ آگے چل کر حُبِّ الٰہی تصوف کا اساسی عنصر قرار پایا۔ اس زمانے کے دوسرے قابلِ ذکر بزرگوں کے نام یہ ہیں:[1] امام جعفر صادق (متوفی ۷۶۵ء) ابو حنیفہ نعمان (متوفی ۷۶۸ء) داؤد الطائی (متوفی ۷۸۱ء) حبیب عجمی (متوفی ۷۹۹ء) اور خواجہ حسن بصری۔

یہ بزرگ دین کے معاملہ میں سخت اور احکام شرعی کے پابند تھے اور توبہ کو ترقی کا پہلا زینہ قرار دیتے تھے۔ نہایت خشوع اور خضوع سے عبادت کرتے تھے اور مجاہدہ فی سبیل اللہ کے شائق تھے۔ اس دور کے عابدوں اور زاہدوں کی خصوصیات کثرتِ ذکرِ الٰہی، حُبِّ الٰہی خوف والم اور صبر و رضا ہیں۔ زہد و فقر کے ان رجحانات کا تعلق براہِ راست قرآن سے ہے جس کی تلاوت کا شغف ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ لگاتار تلاوت کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ قرآن کے مخفی روحانی معنوں تک رسائی ہونے لگی۔[2] گو یہ بزرگ ریاضت اور مجاہدے پر زیادہ زور دیتے تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے تصوف کی وجدانی اور ماورائی خصوصیات کا راز پالیا تھا اور مذہب کے خارجی لوازمات کو نظر انداز کرنے لگے تھے۔

تصوف کا دوسرا دور صوفیائے کرام

عہدِ بنی اُمیہ کے آخر زمانے میں تصوف، زہد و فقر سے الگ ایک مختلف شکل اختیار کرنے لگا۔ اور عباسیوں کے ابتدائی زمانے تک ایک باضابطہ نظام بن گیا۔ اس زمانے میں بیرونی اثرات کے تحت تصوف نے بعض ایسے عناصر کو قبول کیا جن کی بنا پر راسخ العقیدہ حلقوں میں اسے اسلام کے معارض اور مخالف سمجھا جانے لگا۔[3] پہلے دور کا سیدھا سادا فقر و فاقہ کا نظریہ ایک قلیل عرصہ میں

---

[1] ڈاکٹر تارا چند: IIIC، ص ۶۸ [2] پروفیسر آربری: SUFISM، ص ۲۳
[3] نکلسن: L.H.A، ص ۳۸۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مکمل وحدتِ وجودی مسلک بن گیا۔[1] اس دور میں تصوف نے ایک مستقل علمی صورت اختیار کرلی، فلسفہ کا اثر ظاہر پر ہی نہ رہا، باطن پر بھی پڑنے لگا۔ تصوف میں اب علمی طور پر سعادتِ نفس اور نجاتِ روح کے مسائل حل کئے جانے لگے اور ان کا الگ نظام بنا کر انھیں باقاعدہ طور پر مدون کیا گیا۔ ڈاکٹر نکلسن اس امر میں وان کریمر سے متفق ہیں کہ دوسرے دور کے تصوف اور پہلے دور کے زہد و فقر میں بنیادی فرق ہے۔[2]

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ زہد و فقر کے رجحانات آٹھویں صدی میں عرب، عراق، شام و خراسان سے سارے عالمِ اسلام میں پھیل چکے تھے۔ محض ریاضت یا عبادت ایک خشک اور بے روح چیز ہے۔ جب تک اس میں روحانی جذبہ کا عنصر شامل نہ ہو اس کی اپیل عالمگیر نہیں ہو سکتی۔ ابتدائی تصوف میں یہ تبدیلیاں سب سے پہلے بغداد میں رونما ہوئیں۔ بغداد کو اس وقت فقہ، فلسفہ اور دوسرے علوم کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ اس علمی فضا میں ہندی اور یونانی اثرات شدت سے کار فرما تھے۔[3] تعجب نہیں کہ تصوف نے ان دونوں سے کچھ نہ کچھ اثر قبول کیا ہو۔

ڈاکٹر نکلسن اس دور کا سب سے پہلا صوفی معروف کرخی (متوفی ۸۱۵ء) کو قرار دیتے ہیں۔[4] لیکن اس کے نظریات کی نوعیت زاہدانہ ہے، عارفانہ نہیں۔ نظریۂ معرفت پیش کرنے کا افتخار ابو سلیمان دارانی (متوفی ۸۳۰ء) کو حاصل ہے۔ حارث محاسبی (متوفی ۸۳۷ء) اس دور کے وہ قابلِ قدر صوفی ہیں جن کی تصانیف مابعد کے صوفیوں کے لئے نشانِ راہ کا حکم رکھتی ہیں۔[5] ذوالنون مصری (متوفی ۸۶۰ء) اور سری سقطی (متوفی ۸۶۷ء) ان کے ہم عصر تھے۔ سری سقطی نے وحدتِ وجود کا وہ نظریہ پیش کیا جس نے بعد کو وحدتِ وجود کی شکل

---

[1] ڈاکٹر تارا چند: I.I.I.C ؛ ص ۶۹ [2] L.H.A. ؛ ص ۳۸۳ [3] پروفیسر محمد حبیب تمہید ELLIOT & DOWSONS' HISTORY OF INDIA VOL II ؛ ص ۳۲

[4] L.H.A. ؛ ص ۳۸۵

[5] پروفیسر آربری: SUFISM ، ص ۵۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اختیار کی[1] ذوالنون نے حال و مقام سے بحث کی اور معرفت کے لئے عشق کی اہمیت پر زور دیا۔ لیکن وحدتِ وجود کے جو رجحانات ان دونوں کے ہاں دبے دبے ملتے ہیں، بایزید (ابو یزید) بسطامی (متوفی ۸۷۴ء) نے انھیں بے محابا اور بے باکانہ ظاہر کیا۔ اس لحاظ سے وہ تصوف کے اولیں مست مئے عرفان صوفی ہیں۔ ان کے ہاں فنائے نفس اور اتحادِ ذاتِ الٰہی کا جذبہ اتنا بڑھ گیا کہ شرع سے ٹکرانے لگا۔ ان کے اس قسم کے اقوال[2]:

لا الہ الا انا فاعبدنی، میرے سوا کوئی معبود نہیں، میری عبادت کرو
سبحانی ما اعظم شانی میری شان کتنی بلند ہے۔

پر کفر و ضلالت کے فتوے صادر کئے گئے۔ خراز (متوفی ۸۹۹) کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریرات کے ذریعہ ان بے اعتدالیوں کا تدارک کرنے کی کوشش کی جہاں تک تصوف کے مقصود، مفہوم اور طریقۂ کار کو شرح و بسط کے ساتھ سمجھانے کا تعلق ہے، اس کا فخر جنید (متوفی ۹۱۰ء) کو حاصل ہے[3] لیکن انھوں نے اپنے خیالات کو قلم بند نہیں کیا اور تصوف میں یہ کمی منصور بن حلاج (متوفی ۹۲۲ء) کی تصانیف سے پوری ہوئی۔ کتاب طواسین تصوف کے موضوع پر پہلی قابلِ ذکر کتاب ہے۔ منصور امتزاجِ بشریت اور الوہیت کے قائل تھے لیکن انسان اور خدا کے تعلق کو انھوں نے جس پیرایہ میں ادا کیا وہ عام طور پر قرآن کی تعلیم کے خلاف سمجھا گیا۔ منصور اور بایزید بسطامی میں یہ بات مشترک ہے کہ وہ دونوں انتہا پسند تھے اور عرفانِ حق میں اس قدر جذب و محو تھے کہ اپنی قلبی واردات کو بلا خوف و تامل بیان کر دیتے تھے منصور کو اس جرأت اور بے باکی کی قیمت زندگی دے کر چکانا پڑی۔

نویں صدی کا زمانہ تصوف کی نشوونما کے لحاظ سے نہایت اہم ہے۔ محاسبی، جُنید اور حلاج کے علاوہ کئی دوسرے کم اہم صوفی بھی اسی زمانہ سے تعلق رکھتے تھے۔ تصوف کے ماورائی

---

[1] پروفیسر حلمی: تاریخ تصوف اسلام؛ ص ۲۰۵ [2] ایضاً ص ۲۱۴
[3] ڈاکٹر عابد حسین: ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب؛ ص ۳۹۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور وحدتِ وجودی رجحانات اس زمانے میں اپنی انتہا کو پہنچ گئے اور روحانی جذبہ کی شدت اور فراوانی کا ساتھ دینے کے لئے شعر و سخن کا سہارا لیا گیا۔ اس دور کے کئی صوفی رابعہ اور ذوالنون کی طرح خود بھی شاعر تھے۔ حقیقی عشق کے جذبات کو بیان کرنے کے لئے مجازی عشق کی اصطلاحوں کو اپنا لیا گیا۔ جذبہ اور تخیل کے اس امتزاج سے دل چوٹ کھانے لگے اور صوفیانہ خیالات کی اثر آفرینی کی کوئی حد نہ رہی۔ تصوف اب مقبولِ خاص و عام ہو چکا تھا اس کے باوجود تصوف کو شرعی بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے اس کی علمی تشکیل کی ضرورت محسوس ہوئی۔

علمائے تصوف کا دور | تصوف کی علمی تشکیل کے کام کو مندرجہ ذیل بزرگوں نے اپنی تصانیف اور مؤلفات کے ذریعہ بطریق احسن انجام دیا۔ ان کے اپنے اپنے زاویۂ نگاہ ہیں لیکن مقصد تقریباً سب کا تصوف کو شرع سے قریب تر لانا تھا: امام شبلی (متوفی ۹۴۶ء) طبقات، ابوسعید ابن العربی (متوفی ۹۵۲ء) طبقات، ابومحمد الخلدی (متوفی ۹۵۹ء) حکایات الاولیا، عبدالجبار (متوفی ۹۶۱ء) کتاب المواقف، اور کتاب المخاطبات ابونصر سراج (متوفی ۹۸۸ء) کتاب اللمع، ابوطالب مکی (متوفی ۹۹۶ء) قوت القلوب، شیخ ابوبکر (متوفی ۱۰۰۰ء) التعارف المذہب، ابوعبدالرحمٰن السلمی (متوفی ۱۰۲۱ء) طبقات الصوفیئن، ابونعیم اصبہانی (متوفی ۱۰۳۸ء) حلیۃ الاولیا، ابوالقاسم قیشری (متوفی ۱۰۷۲ء) رسالہ، شیخ علی ہجویری (۱۰۷۲-۷۹ء) کشف المحجوب اور عبداللہ انصاری ہروی معروف بہ پیر ہری (متوفی ۱۰۸۸ء) منازل السائرین۔[1]

ان سب کوششوں کا اثر یہ ہوا کہ تصوف جو آٹھویں صدی تک ایک رہبانی فرقہ تک محدود تھا، دسویں اور گیارہویں صدی میں ایک علمی اور وجدانی نظریہ بن گیا۔ اس کے بعد سے وحدتِ وجود کو تصوف میں بنیادی حیثیت حاصل ہو گئی اور خدا کے محیطِ کل ہونے پر زور دیا جانے لگا۔ شریعت اور تصوف میں تطابق پیدا کرنے کی ان کوششوں کے باوجود علما اور فقہا اس کی سختی سے مخالفت کرتے رہے لیکن چونکہ متصوفانہ خیالات عوام میں مقبول ہو چکے

---

[1] جن صوفیا سے ایک سے زیادہ کتابیں منسوب ہیں اُن کی صرف اہم ترین تصنیف کا نام درج کیا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے، فقہاء کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ حتیٰ کہ گیارہویں صدی میں امام غزالی (متوفی ۱۱۱۱ء) نے اپنی غیر معمولی قوتِ استدلال سے کام لے کر تصوف کے جواز پر سند کردی۔ ویدانت میں جو رتبہ شنکر آچاریہ (متوفی نویں صدی عیسوی) کو حاصل ہے، اسلامی فلسفہ میں وہی مقام امام غزالی کو حاصل ہے۔ اس اعتبار سے انھیں حجت اسلام، کہا جاتا ہے۔ غزالی کے زمانہ میں مسلمانوں میں چار قسم کی ذہنی تحریکیں کام کر رہی تھیں اسماعیلیوں اور باطنیوں کا فلسفہ، اشراقی اسطاطالیسی فلسفہ، علمائے ظاہر کا علم کلام اور صوفیوں کا علم باطن" بقول ڈاکٹر عابد حسین ان میں سے ایک بھی اپنی موجودہ حالت میں ایسا نہ تھا جو اسلام کی حقیقی روح سے مطابقت رکھتا ہو "غزالی[1] نے ان سب کا جائزہ لے کر اسلام کو قرآن سے قریب تر لانے کی کوشش کی انھوں نے بتایا کہ توحیدِ ذات کا صحیح تصور تصوف کے بغیر ممکن ہی نہیں[2]۔ غزالی کا کارنامہ نظریہ تصوف کی از سرِ نو تشکیل ہے "مذہبی واردات کی حقیقت کو جیسا انھوں نے سمجھا بہت کم مفکروں نے سمجھا ہوگا۔ وہ ایمان بالیقین کے تین مدارج قرار دیتے ہیں۔ پہلا درجہ عوام کی تقلید پرستی کا ہے۔ دوسرا علماء کے استدلالی علم کا، تیسرا بلا واسطہ مشاہدے اور عرفان کا۔ جس طرح ظاہری تجربے کا آلہ حواسِ ظاہری ہیں اُسی طرح باطنی تجربے یا مشاہدے کا آلہ حسِ باطنی ہے۔ یہ حسِ باطنی یا وجدانِ عقل کی ایک اعلیٰ صورت ہے جو بدرجۂ کمال انبیاء اور مرسلین میں اور ان کے بعد متقی صوفیوں میں موجود ہوتی ہے"[3]

اپنے نظریات کو غزالی نے اس خوبی سے پیش کیا کہ طریقت اور شریعت کا فرق مٹ گیا اور علمی تصوف کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

تصوف کے نظری نظاموں میں سے دو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ایک وہ جو "نور" کو حقیقتِ مطلق قرار دیتے ہیں اور دوسرے جو حقیقتِ مطلق "خیال" کو ٹھہراتے ہیں۔ پہلے کو

---

[1] ہندوستانی قومیت ... ص ۴۰۸ [2] ایضاً ص ۴۱۰

[3] پروفیسر آربری: SUFISM ، ص ۸۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شیخ شہاب الدین سہروردی (متوفی ۱۲۳۴ء) سے اور دوسرے کو ابن عربی (متوفی ۱۲۴۰ء) اور ان کے شارح عبدالکریم جیلی (متوفی ۱۴۰۶ء) سے منسوب کیا جاتا ہے[1]

سلاسل اور طریقے تصوف کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے زیرِ اثر بارہویں صدی سے صوفیوں کے کئی طریقے قائم ہونا شروع ہوئے۔ پروفیسر نظامی کا بیان ہے[2] کہ منگولوں کی پیدا کی ہوئی ابتری کو صوفیا نے روحانی سلاسل کے قیام سے پورا کیا۔ ہجویری نے کشف المحجوب میں ایسے بارہ سلاسل کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے حلولی اور حلاجی تناسخ کے قائل تھے اس لئے انھیں مردود سمجھا جاتا تھا، باقی دس گروہ یہ ہیں: طیفوریہ، قصاریہ، ملامتیہ، نوریہ، محاسبیہ، تستریہ، حکمیہ، خرازیہ، خفیفیہ اور سیاریہ۔ آگے چل کر ان کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ سولھویں صدی میں صرف ہندوستان میں ایسے چودہ سلسلے موجود تھے، جن کا ذکر ابو الفضل نے آئینِ اکبری میں کیا ہے[3]۔ عالمِ اسلام میں جو طریقے سب سے زیادہ مقبول و معروف ہوئے وہ یہ چار ہیں۔

(۱) محی الدین عبدالقادر جیلانی (متوفی ۱۱۶۶ء) کا قادریہ

(۲) شہاب الدین سہروردی (متوفی ۱۲۳۴ء) کا سہروردیہ

(۳) عبداللہ شاذلی (متوفی ۱۲۵۸ء) کا شاذلیہ

(۴) مولانا جلال الدین رومی (متوفی ۱۲۷۳ء) کا مولویہ

ان میں سے مولویہ ترکی میں اور شاذلی سلسلہ زیادہ تر مصر، شمالی افریقہ، عرب اور شام میں مقبول ہوا۔ ہندوستان میں قادریہ اور سہروردیہ کا سکہ رائج رہا گو مشرقی پاکستان اور بنگال میں سہروردیہ نسبتاً زیادہ مقبول ہے۔ برصغیر ہندوسند میں ان دو کے علاوہ جو اور سلسلے رائج ہیں ان میں خواجگان اور چشتیہ سلسلے نہایت ہی مشہور ہیں۔ سلسلۂ خواجگان کو خواجہ محمد اتا الیسوی (متوفی ۱۱۶۶ء) اور چشتیہ کو شیخ ابو اسحاق شامی (متوفی ۹۴۰ء) سے منسوب کیا جاتا ہے گو چشتیہ کو ہندوستان میں پھیلانے اور پروان چڑھانے کا شرف خواجہ معین الدین حسن سنجری (متوفی

[1] I.I.I.C, P 71 [2] تاریخ مشائخ چشت، ص ۱۲۹ [3] آئینِ اکبری ص ۲۰۳ حصہ دوم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۲۳۵ء) کو حاصل ہے۔

بارہویں صدی کے بعد غزالی کے اثر سے تصوف کے عملی پہلو کی مخالفت تو ختم ہو گئی لیکن نظری پہلو مسلمانوں کے ہندوستان داخل ہونے کے زمانہ تک فقیہوں کے نزدیک الحاد سمجھا جاتا رہا چنانچہ شیخ شہاب الدین جیسے زبردست صوفی کو ۱۲۰۹ء میں قتل کر دیا گیا۔

"پھر بھی متصوفانہ خیالات حکماء کی فکر سے گزر کر شعراء کے تخیل پر چھا گئے، ان کے کلام میں رچ گئے اور شعر کے جادو سے خاص و عام کی زبان پر چڑھ گئے" عربی زبان کے ایسے شاعروں میں عمر بن الفرید (متوفی ۱۲۳۵ء) اور فارسی کے شاعروں میں ابو سعید ابن ابی الخیر (متوفی ۱۰۴۸ء) حکیم سنائی (متوفی ۱۱۵۰ء) فرید الدین عطار (متوفی ۳۰-۱۲۲۹ء) جلال الدین رومی (متوفی ۱۲۷۳ء) سعدی (متوفی ۱۲۹۱ء) حافظ (متوفی ۱۳۸۹ء) نظامی (متوفی ۱۱۹۹ء) جامی (متوفی ۱۴۹۲ء) اوحدی (متوفی ۱۳۳۷ء) اور عراقی (متوفی ۱۲۸۹ء) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ڈاکٹر نکلسن کا بیان ہے کہ تصوف سے ایرانی ذہن کو عربی ذہن سے کہیں زیادہ مناسبت ہے[۱] یہی وجہ ہے کہ گیارہویں صدی سے آج تک فارسی شاعر تصوف کی اصطلاحوں میں شاعری کرتے ہیں، فارسی کی طرح یہ بات اردو شاعری پر بھی صادق آتی ہے اردو کے مشہور غزل گو شاعر آج بھی صوفیوں کے سلسلوں سے باقاعدہ تعلق رکھتے ہیں۔

ابن فرید، ابن عربی اور رومی کا زمانہ تصوف کے عروج کا زمانہ تھا اس کے بعد سے اس میں زوال اور انحطاط کے نشانات نمودار ہونے لگتے ہیں گو انفرادی طور پر ہر دور میں ایسے صوفی رہے ہیں جو ذاتی طور پر خوبیوں اور رفعتوں کے حامل تھے۔ آگے چل کر تصوف کی پہلی سی عزت و توقیر باقی نہ رہی کیوں کہ مجموعی طور پر اب یہ تقشف سے زیادہ تکلف اور قناعت سے زیادہ نجاعت بن گیا[۲] بلادِ اسلام میں اس کے زوال کی داستان ہر جگہ مختلف ہے لیکن تصوف کے زوال کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اب بھی اسلام کی دینی زندگی کا ایک عنصر ہے، خاص طور پر برصغیر ہندوستند کا ہر مسلمان خواہ وہ کسی بھی مکتبِ فکر کا حامی ہو تصوف سے شغف رکھتا ہے۔

---

[۱] LITERARY HISTORY OF ARABS، ص ۳۹۴ [۲] پروفیسر حلمی: تاریخ تصوف اسلام (اردو ترجمہ) ص ۳۲۳

© rasailojaraid.com